اقبالؒ کی کہانی خود اقبالؒ کی زبانی

یہ ’’کہانی‘‘ سوانح عمری نہیں ہے جس میں ترتیبِ واقعات کو پیشِ نظر رکھا جاتا ہے۔ یہ صرف اقبالؒ کے قلب و دماغ کی مختلف کیفیتوں کا مطالعہ ہے جسے زمان و مکان کی قیود سے الگ ہٹ کر پیش کیا گیا ہے۔ لہٰذا اس ’’کہانی‘‘ کو اسی زاویۂ نگاہ سے دیکھئے۔ (طلوع اسلام)

برادرانِ عزیز!

علامہ اقبالؒ نے اپنے آخری کلام ارمغانِ حجاز میں کہا ہے کہ

چو رختِ خویش بر بستم ازیں خاک
ہمہ گفتند باما آشنا بود!
و لیکن کس ندانست ایں مسافر
چہ گفت و با کہ گفت و از کجا بود

جب کیفیت یہ ہے کہ خود اقبالؒ کے اپنے اندازے کے مطابق، کوئی شخص اقبالؒ کی حقیقت سے کماحقہٗ واقف نہیں ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر حقیقی اقبالؒ کی جھلک دیکھی کہاں سے جائے؟ اس سوال کا جواب چنداں مشکل نہیں۔ اس لئے کہ اقبالؒ خود اپنے متعلق اتنا کچھ کہہ گیا ہے کہ اس سے ان کی پوری تصویر نگہ ٔتجسس کے سامنے آجاتی ہے۔ میرے لئے یہ تو مشکل ہے کہ اس مختصر سے وقت میں اس تصویر کے تمام گوشوں کی تفاصیل آپ کے لئے جنت نگاہ بنا سکوں۔ اس وقت صرف اتنا ہو سکے گا کہ اس کے ابھرے ہوئے نقش و نگار اور نمایاں خط و خال سامنے لائے جا سکیں۔ اس مرقعِ نگہ تاب اور پیکرِ خوش انداز کی تفصیلی گل کاریوں اور جلوہ طرازیوں کو میں نے اپنی اس تالیف کے لئے اٹھا رکھا ہے جو اقبال اور قرآن، کے عنوان سے میرے پیش نظر ہے اور جسے میں، حضرت علامہ کے ان احساناتِ عظیم کے زیر احساس، جن سے

میری نگہ تشکر ہمیشہ نگوں سار رہے' اپنے ذمہ ایک قرض سمجھتا ہوں۔ خدا مجھے اس قرض حسنہ سے سبکدوش ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ **وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم**

اس وقت میری دوسری مشکل یہ ہے کہ حضرت علامہ کے کلام کا بیشتر حصہ فارسی میں ہے اور اس قسم کا مخلوط مجمع فارسی زبان کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ اس لئے مجھے مجبوراً ان کے اردو کلام ہی پر اکتفا کرنا ہوگا اور فارسی اشعار صرف ان مقامات پر پیش کئے جائیں گے جہاں ایسا کرنا ناگزیر ہو۔

انیسویں صدی کے آخرِ شب کے ستارے جھلملا رہے ہیں اور بیسویں صدی کی نازنینۂ سحر انگڑائیاں لے رہی ہے۔ قلبِ زندہ دلانِ پنجاب' یعنی لاہور کی کیف بار فضائیں' شباب وشعر کی نکہتوں اور رنگ ونظر کی نزہتوں سے دامانِ باغبان و کفِ گل فروش کا منظر پیش کر رہی ہیں۔ گورنمنٹ کالج کی درسگاہ اپنے معیارِ تعلیم کی بلندی کے ساتھ ساتھ دولت مند خاندانوں کے عشرت پسند نونہالوں کی لاابالیوں کے لئے دور دور تک شہرت حاصل کر چکی ہے' کہ اتنے میں سیالکوٹ کے ایک متوسط خاندان کا نہایت ذہین طالب علم اس حیرت کدۂ علم وتماشا میں آنکلتا ہے۔ شروع شروع میں جہاں وہ نوجوان اس فضا کو اپنے لئے غیر مانوس پاتا ہے' وہاں خود وہ فضا بھی اس نووارد کو اجنبی سا محسوس کرتی ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ کیفیت یہ ہوجاتی ہے کہ وہ نووارد طالب علم اپنی سحر طرازیوں سے اس پوری فضا پر چھا جاتا ہے اور جس محفل میں شریک ہوجاتا ہے اسے تبسم فشاں وقہقہہ بار بنا دیتا ہے۔ تعلیمی منازل میں اس کا یہ عالم ہے کہ اساتذہ اس کا معلم کہلانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ دوستوں کی مجلس میں یہ کیفیت ہے کہ ہر شخص اس سے قریب تر ہونے میں ایک خاص نشاطِ روح محسوس کرتا ہے۔ اس کی شرکت سے شعر وسخن کی محفلوں میں ایک تازہ حرارت پیدا ہوجاتی ہے۔ غرضیکہ تھوڑے ہی دنوں میں یہ محسوس ہونے لگ جاتا ہے کہ اس سے پیشتر لاہور محض ایک پیکر آب وگل تھا اور اس میں زندگی اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ پہلے پہل ابھی مسکرائی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس نوجوان کی حالت یہ ہے کہ وہ اس محفل طرب ونشاط کے کسی ساز کو اپنا ہم آہنگ اور اس گلکدۂ حسن وتماشا کے کسی پھول کو اپنا ہمرنگ نہیں دیکھتا۔ اسے ہر ایک اپنا ہمنوا اور ہم ذوق سمجھتا ہے لیکن وہ کسی کو بھی اپنا ہم صفیر و ہم نگاہ نہیں پاتا۔ اس کی شرکت سے اجڑی ہوئی محفلوں پر بھی بہار آجاتی ہے لیکن یہ بھری محفلوں میں بھی

اپنے آپ کو تنہا پاتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کسی شے کی جستجو ہے جس نے اسے سراپا اضطراب بنا رکھا ہے۔ کوئی خلش تجسس ہے جو اسے کسی پہلو چین نہیں لینے دیتی۔ وہ اپنی تشنگیٔ ذوق کی تسکین کے لئے ہر دور سے نظر آنے والے چشمہ کی طرف لپکتا ہے لیکن اسے سراب پا کر مضطرب و بیقرار واپس آجاتا ہے۔ وہ کبھی اسی تسکین خاطر کے لئے لارنس گارڈن میں جانکلتا ہے لیکن اس جہان رنگ وبو کی جمال افروز شادابی و شگفتگی بھی اس کے لئے جاذب نگاہ نہیں بنتی۔ وہ ایک حسین شاخ پر چہچہانے والے ''گل رنگین'' کو نہایت غور سے دیکھتا اور اس سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ ؎

تو شناسائے خراشِ عقدۂ مشکل نہیں
اے گلِ رنگیں ترے پہلو میں شاید دل نہیں
زیبِ محفل ہے، شریکِ شورشِ محفل نہیں
یہ فراغت بزمِ ہستی میں مجھے حاصل نہیں
اس چمن میں، میں سراپا سوز و سازِ آرزو
اور تیری زندگانی بے گدازِ آرزو
سو زبانوں پر بھی خاموشی تجھے منظور ہے
راز وہ کیا ہے ترے سینے میں جو مستور ہے
میری صورت تو بھی اِک برگِ ریاضِ طور ہے
میں چمن سے دور ہوں تو بھی چمن سے دور ہے
مطمئن ہے تو، پریشاں مثلِ بو رہتا ہوں میں
زخمیٔ شمشیرِ ذوقِ جستجو رہتا ہوں میں

ہوسکتا تھا کہ وہ اس خلشِ پیہم اور سوزِ مسلسل کے ہاتھوں تنگ آ کر اپنی زندگی کا رُخ بدل لیتا لیکن کوئی بے صوت صدا ہے جو چپکے ہی چپکے اس کے کان میں کہہ دیتی ہے اور وہ خود ہی پکار اٹھتا ہے کہ نہیں! مجھے گھبرانا نہیں چاہئے۔ کہیں

یہ پریشانی مری سامانِ جمعیت نہ ہو؟
یہ جگر سوزی چراغِ خانۂ حکمت نہ ہو؟

ناتوانی ہی مری سرمایۂ قوت نہ ہو؟
رشکِ جامِ جم میرا آئینۂ حیرت نہ ہو؟
یہ تلاشِ متصل، شمع جہاں افروز ہے
توسنِ ادراکِ انساں کو خرام آموز ہے

یہ تسکین اسے پھر آمادۂ تجسس کر دیتی اور وہ ہلاکِ ذوقِ جستجو پھر اسی تپش و خلش کے لئے سیماب پا ہو جاتا۔ جب اس سے پوچھا جاتا کہ بالآخر اس سوزِ پیہم اور خلشِ مسلسل کی وجہ کیا ہے؟ ہر شخص نے اپنی زندگی کا کوئی نہ کوئی مقصود متعین کر رکھا ہے اور اس کا دل اس سے مطمئن ہے لیکن ایک تم ہو کہ تمہیں کسی پہلو قرار ہی نہیں۔ کوندے کی لپک کی طرح یہاں سے وہاں، اور شعلے کی تڑپ کی طرح وہاں سے یہاں۔ وہ سب کچھ سنتا اور ایک آہ بھر کر کہہ دیتا کہ

چہ کنم کہ فطرتِ من بہ مقام در نسا زد
دلِ ناصبور دارم چو صبا بہ لالہ زارے
چو نظر قرار گیرد بہ نگار خوبروئے
تپد آں زماں دل من پئے خوب تر نگارے
نہ شرر ستارہ جوئم، زستارہ آفتابے
سرِ منزلے ندارم کہ بمیرم از قرارے
طلبم نہایتِ آں کہ نہایتے نہ دارد
بہ نگاہ نا شکیبے، بدلِ امیدوارے

اس کی فطرت کی یہی سیمابیت اور ذوقِ جستجو کی اضطرابیت تھی جو اسے ہر محفل میں دیوانہ وار لئے لئے پھرتی تھی۔ کبھی حکمت و فلسفہ کی خشک گھاٹیوں میں، کبھی شعر و ادب کی شاداب وادیوں میں، کبھی مسجد و خانقاہ کی خلوتوں میں اور کبھی محفل رنگ و چنگ کی جلوتوں میں اور یہ سب کچھ اس بے باکانہ اعتراف کے ساتھ کہ

مُدتے با لالہ رویاں ساختم
عشق با موغولہ مویاں باختم

بادہ ہا با ماہ سیمایاں زدم
بر چراغِ عافیت داماں زدم

چنانچہ اسکی یہ ہر رہ نوروی اور ہر منزل نشینی کی کیفیت جسے قرآن نے فی کل وادیھیمون کی شاعرانہ نفسیاتی کیفیت سے تعبیر کیا ہے، دیکھنے والوں کے دل میں اس کے متعلق عجیب وغریب خیالات پیدا کیا کرتی۔ اسی کیفیت کو ایک مولوی صاحب کی زبان سے سنئے جو اس زمانہ میں اقبالؒ کی ہمسائیگی میں رہتے تھے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:

حضرت نے مرے ایک شناسا سے یہ پوچھا
اقبالؒ کہ ہے قمریٔ شمشادِ معانی
پابندیٔ احکامِ شریعت میں ہے کیسا؟
گو شعر میں ہے رشکِ حکیم ہمدانی
سمجھا ہے کہ ہے راگ عبادات میں داخل
مقصود ہے مذہب کی مگر خاک اُڑانی
کچھ عار اسے حسن فروشوں سے نہیں ہے
عادت یہ ہمارے شعراء کی ہے پُرانی
گانا جو ہے شب کو تو سحر کو ہے تلاوت
اس رمز کے اب تک نہ کُھلے ہم پہ معانی
لیکن یہ سُنا اپنے مریدوں سے ہے میں نے
بے داغ ہے مانند سحر اس کی جوانی

☆☆☆

اس شہر میں جو بات ہو اُڑ جاتی ہے سب میں
میں نے بھی سُنی اپنے احبّا کی زبانی
اِک دن جو سرِ راہ ملے حضرت زاہد
پھر چھڑ گئی باتوں میں وہی بات پرانی

میں نے یہ کہا کوئی گلہ مجھ کو نہیں ہے
یہ آپ کا حق تھا زرہِ قرب مکانی
گر آپ کو معلوم نہیں میری حقیقت
پیدا نہیں کچھ اس سے قصورِ ہمہ دانی
میں خود بھی نہیں اپنی حقیقت کا شناسا
گہرا ہے مرے بحرِ خیالات کا پانی
مجھ کو بھی تمنا ہے کہ اقبالؒ کو دیکھوں
کی اس کی جدائی میں بہت اشک فشانی
اقبالؒ بھی اقبالؒ سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں تمسخر نہیں، واللہ نہیں ہے

واعظ کو اس قسم کے مسلک سے وجہٗ شکایت بجا تھی لیکن حیرت تو یہ ہے کہ اس باب میں رندانِ میکدہ بھی کچھ کم گِلہ طراز نہ تھے۔ ان کی بھی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اقبالؒ ہے کیا؟ وہ بھی یہ کہتے تھے کہ

ہے عجب مجموعۂ اضداد اے اقبالؒ تو
رونقِ ہنگامۂ محفل بھی ہے، تنہا بھی ہے
عین شغل مے میں پیشانی ہے تیری سجدہ ریز
کچھ ترے مسلک میں رنگِ مشربِ مینا بھی ہے
ہے حسینوں میں وفا ناآشنا تیرا خطاب
اے تلون کیش! تو مشہور بھی رسوا بھی ہے
لے کے آیا ہے جہاں میں عادتِ سیماب تو
تیری بے تابی کے صدقے! ہے عجب بیتاب تو

یہ سن کر اقبالؒ مسکراتا اور کہتا کہ

عشق کی آشفتگی نے کر دیا صحرا جسے

مشتِ خاک ایسی نہاں زیرِ قبار رکھتا ہوں میں
آرزو ہر کیفیت میں اک نئے جلوے کی ہے
مضطرب ہوں، دل سکوں نا آشنا رکھتا ہوں میں
فیض ساقی شبنم آسا، ظرفِ دل دریا طلب
تشنۂ دائم ہوں، آتش زیر پا رکھتا ہوں میں

خلشِ آرزو سے اقبالؒ کی یہ آشفتگی روز بروز بڑھتی گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کے سینۂ شعلہ ساماں و آذر فشاں میں جو حشر بپا ہو رہا ہے اسے اپنے ہم جلیس احباب کو کس طرح دکھائے! یہی وجہ تھی کہ وہ بھری محفل میں بھی اپنے آپ کو تنہا پاتا تھا اور یہ تنہائی اسے رہ رہ کر ستاتی تھی۔ حتیٰ کہ وہ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا تھا کہ

لطف مرنے میں ہے باقی نہ مزہ جینے میں
کچھ مزہ ہے تو اسی خونِ جگر پینے میں
کتنے بیتاب ہیں جوہر مرے آئینے میں
کس قدر جلوے تڑپتے ہیں میرے سینے میں
اس گلستاں میں مگر دیکھنے والے ہی نہیں
داغ جو سینے میں رکھتے ہیں وہ لالے ہی نہیں

اسے تلاش تھی کسی ایسے محرم راز کی جو اس کی سنتا اور اسے سمجھتا۔ لیکن اسے کہیں ایسا ہمنوا نہیں ملتا تھا حتیٰ کہ وہ اپنی تلاش میں تھک کر کہہ اٹھتا کہ

یہاں کہاں ہم نفس میسر، یہ دیس نا آشنا ہے اے دل
وہ چیز تو مانگتا ہے مجھ سے کہ زیر چرخِ کہن نہیں ہے

اسے اس تنہائی کا احساس آخر تک رہا۔ اس لئے کہ وہ جس دیس کی بولی بولتا تھا اسے سمجھنے والا یہاں کوئی نہ تھا۔ اس لئے وہ ہر راہرو سے کہتا کہ

غریبِ شہر ہوں میں، سن تو لے مری فریاد
کہ تیرے سینے میں بھی ہوں قیامتیں آباد

مری نوائے غم آلود ہے متاعِ عزیز
جہاں میں عام نہیں دولتِ دلِ ناشاد
گلہ ہے مجھ کو زمانے کی کور ذوقی سے
سمجھتا ہے میری محنت کو محنتِ فرہاد
صدائے تیشہ کہ برسنگ می خورد دِگر است
خبر بگیر کہ آوازِ تیشہ و جگر است

یہ تنہائی بعض اوقات اس قدر شدت اختیار کر جاتی کہ وہ سمجھتا کہ وہ کسی اور دنیا کا انسان ہے جو بھولے بھٹکے یہاں چلا آیا ہے۔ وہ راتوں کی تنہائیوں میں اٹھ اٹھ کر روتا اور خدا سے کہتا کہ

دریں میخانہ اے ساقی ندارم محرمے دیگر
کہ من شاید نخستیں آدمم از عالمے دیگر

لیکن اس تنہائی کے باوجود، کسی فردوسِ گم گشتہ کی تلاش تھی جو اسے ہر وقت گوشہ بگوشہ لئے لئے پھرتی تھی۔ تلاشِ حقیقت کی یہی خلش بے پایاں تھی جو اسے دانشکدۂ فرنگ میں لے گئی۔ وہاں پہنچ کر ایک اور کشمکش شروع ہوگئی یا یوں کہئے کہ اس کی دیرینہ کش مکش کی نوعیت متعین ہو گئی۔ اقبالؒ کی کیفیت یہ تھی کہ ابتدائی تعلیم وتربیت کے اثر سے ایمان اس کے قلب کی گہرائیوں میں پیوست ہو چکا تھا۔ اس کے تحت الشعور میں اس کے نقوش بہت گہرے تھے۔ لیکن دماغی طور پر وہ ابھی تک یکسر فلسفی تھا۔ فلسفہ سے اسے شغف بھی خاص تھا۔ مغرب میں پہنچے تو وہاں کے فلاسفرز کی صحبت اور تعلیم نے اس شغف کو اور گہرا کر دیا۔ لیکن اس سے ہوا یہ کہ جو کچھ قلب کی گہرائیوں میں بلا دلیل و برہان جاگزیں تھا فلسفہ اس کی تائید نہیں کرتا تھا اور جو کچھ فلسفیانہ دلائل وبراہین سے ثابت ہوتا تھا، اس کی گواہی دل نہیں دیتا تھا۔ دل اور دماغ کی یہی وہ کش مکش تھی جو آگے چل کر مشرق ومغرب کی کش مکش کے نام سے ابھری۔ یہی وہ کشمکش ہے جو اقبالؒ کے سارے پیغام میں مختلف اصطلاحات سے سامنے آتی ہے۔ عقل اور عشق، دل اور دماغ، خرد و جنوں، علم وحضور، خبر ونظر، ذکر وفکر، رازی ورومی، ابلیس وجبریل، مصطفیٰؐ و بولہب، اہرمن و یزداں یہ سب تقابل درحقیقت ادراک وجذبات کی اس کشمکش کے مظہر تھے۔ مغرب میں میکانکی تصور

حیات نے انسان کو ایک پیکر آب وگل سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں دی تھی۔ اس تصور کی رو سے زندگی مادی تبدیلیوں سے وجود میں آجاتی تھی اور انہی اجزا کے پریشان ہو جانے سے اس کا خاتمہ ہو جاتا تھا۔ اس کے برعکس، ایمانی تصور حیات کی رو سے حیات انسانی کا سرچشمہ مادہ سے ماوراء تھا اور موت اس کی آخری حد نہیں تھی بلکہ زندگی کی جوئے نغمہ خواں اس کے بعد بھی مسلسل رواں دواں رہتی تھی۔ مغربی سائنس کی رو سے علم کا دائرہ محسوسات کی چار دیواری تک محدود تھا۔ اس کے برعکس ایمانیات کی رو سے علم حقیقی کا سرچشمہ وحی تھا جو سرحد ادراک سے ماوراء تھا۔ مغربی معاشرے کی بنیادیں، تنہا عقل پر استوار تھیں جس کا تقاضا ہر فرد کے اپنے مفاد کا تحفظ ہوتا ہے۔ اس کے برعکس، ایمانیات کی رو سے معاشرہ کی اساس، ان مستقل اقدار پر رکھی جاتی تھی جو تمام نوعِ انسانی کے لئے یکساں طور پر نفع ونقصان اور خیر وشر کی میزان ہوتی ہیں۔ عقل کا تقاضا دوسروں کا سب کچھ چھین کر اپنا آپ بنانا تھا لیکن عشق کا تقاضا، دوسروں کی ربوبیت سے اپنے نشوو ارتقاء کا سامان بہم پہنچانا تھا۔ عقل، انسانی زندگی کو سمٹا کر، انفرادی دائرہ میں محبوس کر دیتی تھی۔ عشق اسے پھیلا کر ساری دنیا پر محیط کر دیتا تھا۔ عقل خود بین تھی، عشق جہاں بیں۔ عقل من و تو کے امتیاز سے درخت کو شاخوں اور پتوں میں منقسم دیکھتی تھی۔ عشق کو ہر ذرہ میں آفتاب پنہاں نظر آتا تھا۔ عقل محوِ تماشائے لب بام رہتی تھی۔ عشق، آتشِ نمرود میں بے خطر کود پڑنے کا متقاضی تھا۔ عقل، بولہبی حیلہ جوئیاں سکھاتی تھی اور عشق روحِ مصطفویؐ کا پیامبر تھا اور یہ حقیقت ہے کہ

ستیزہ کار رہائے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرار بولہبی

عقل و عشق کی یہی کشمکش تھی جس نے دانشکدۂ مغرب میں، اقبالؒ کے سینے کو وقفِ اضطراب کر دیا اور اس سے دن کا چین اور رات کا آرام چھین لیا چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ

اسی کشمکش میں گذریں میری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و سازِ رومی کبھی پیچ و تابِ رازی

یہی وہ دور تھا جس کے متعلق وہ بہت بعد میں کہا کرتے تھے کہ:

مجھے وہ درسِ فرنگ آج یاد آتے ہیں
کہاں حضورؐ کی لذت، کہاں حجابِ دلیل

اقبالؒ کی زندگی میں یہ مقام بڑا مشکل اور یہ دوراہہ بڑا فیصلہ کن تھا۔ اگر اس کش مکش میں دماغ، دل پر غالب آجاتا۔ اگر مملکتِ عشق میں عقل کی حکمرانی ہو جاتی۔ اگر فلسفہ کی دلیلیں، ایمان کی بنیادوں کو متزلزل کر دیتیں۔ اگر زندگی کی سوداگرانہ مصلحت کوشیاں متاعِ فقر و قلندری کو خرید لیتیں تو اس کے بعد نہ صرف یہ کہ اقبال، اقبالؒ نہ ہوتا، بلکہ نہ دنیا کے نقشہ پر پاکستان کا وجود ہوتا اور نہ ہم آپ آج عشق و محبت کے ان جگر سوز افسانوں کو اس طرح دہراتے، نہ ملت اسلامیہ ہندیہ کا اپنا کوئی مستقر و مقام ہوتا اور نہ آج یہاں ایمان و قرآن کے انسانیت ساز تصورات کے چرچے ہوتے۔ اس نازک وقت میں خود اقبالؒ پر کیا گزر رہی تھی اس کا اندازہ وہی کر سکتا ہے جس پر کبھی یہ کیفیات خود وارد ہوئی ہوں۔ جب عقل و حکمت کی فسوں سازیاں، اس کے لئے فریب نگاہ بننے کی کوشش کرتیں تو عشق و مستی کی رندانہ جرأت فرمائیاں، عروسِ حقیقت کے حسین چہرے سے ذرا نقاب سرکا دیتیں۔ وہ حقیقت کی اس ایک چلمنی جھلک سے، فریبِ عقل سے جھنجھلا کر منہ موڑ لیتا اور اثر و درد میں ڈوبی ہوئی نوائے جگر گداز سے کہتا کہ:

الٰہی عقلِ خجستہ پا کو ذرا سی دیوانگی سکھا دے
اسے ہے سودائے بخیہ کاری مجھے سر پیرہن نہیں ہے

اور کبھی بیتاب ہو ہو لا دعائیں مانگتے کہ

عطا اسلاف کا جذبِ دروں کر
شریکِ زمرۂ لا یحزنوں کر
خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں
مرے مولا مجھے صاحبِ جنوں کر

مبداءِ فطرت کا یہ انداز عجیب ہے کہ جب تلاشِ حقیقت کی تڑپ و خلش انتہائی شدت اختیار کر لیتی ہے تو حقیقت اپنے چہرے سے خود آپ نقاب اٹھا دیتی ہے۔ یہی وہ مقام تھا جہاں نبی اکرمؐ سے فرمایا گیا کہ ووجدک ضالاً فھدی۔ ''ہم نے تجھے تلاشِ حقیقت میں سرگرداں پایا تو منزلِ حیات

کی طرف راہنمائی کر دی۔'' چنانچہ جو شخص بھی تلاشِ حقیقت میں سرگرداں رہتا ہے فطرت کا غیر مرئی ہاتھ اس کی راہنمائی کر دیتا ہے۔ عام انسانوں کی صورت میں یہ راہنمائی سبل (یعنی پگڈنڈیوں) کی طرف ہوتی ہے۔ وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ط (29:69) لیکن رسول کی راہنمائی صراطِ مستقیم، یعنی زندگی کی متوازن شاہراہ کی طرف ہوتی ہے۔ پگڈنڈیوں پر چلنے والے اگر اپنا رخ اس صراطِ مستقیم کی طرف کر لیں جس پر رسول ؐ گامزن ہوتا ہے تو ان کی پگڈنڈیاں بھی اسی شاہراہِ حیات سے مل جاتی ہیں۔ ورنہ ان کا کاروانِ حیات فضائے عقل و خرد کے پیچ و خم میں گم ہو کر رہ جاتا ہے۔ جب تلاشِ حقیقت میں قلبِ اقبالؒ کی تپش و خلش بھی شدت تک پہنچ گئی تو اس فیصلہ کن لمحہ میں مبداءِ فیض کی کرم گستری سے اس کا قدم صحیح راستہ کی طرف اٹھ گیا۔ جب عقل کی شر انگیزیوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر کر کہا کہ اس طلسم پیچ و تاب سے نکلنے کی راہ کون سی ہے تو وہ گھبرایا۔ لیکن ایک ثانیہ میں اس کا دل پر سوز پکار اٹھا کہ ؎

چارہ این است کہ از عشق کشادے طلبیم
پیشِ او سجدہ گذاریم و مرادے طلبیم

اس جواب سے اقبالؒ کا وہ قلبِ بیتاب جو اس کشمکش خرد و جنوں سے سراپا اضطراب بن رہا تھا۔ ایمان و یقین کی طمانیت بخش آسودگی سے قرار و سکون کی جنت بن گیا۔ یہی وہ لمحہ تھا جس کی یاد میں وہ اس کیف و مستی سے پکار اٹھتا تھا کہ:

جستجو جس گل کی تڑپاتی تھی اے بلبل مجھے
خوبیٔ قسمت سے آخر مل گیا وہ گل وہ لے مجھے

جس کا نتیجہ یہ ہے کہ:

اب تاثر کے جہاں میں وہ پریشانی نہیں
اہلِ گلشن پر گراں میری غزلخوانی نہیں
قید میں آیا تو حاصل مجھ کو آزادی ہوئی
دل کے مٹ جانے سے میرے گھر کی آبادی ہوئی

ضَو سے اُس خورشید کی اختر میرا تابندہ ہے
چاندنی جس کے غبار راہ سے شرمندہ ہے
یک نظر کردی و آدابِ فنا آموختی
اے خنک روزے کہ خاشاکِ مرادرسوختی

اس سے اقبالؒ کے دل کو کس قدر یکسوئی نصیب ہوگئی اس کی خفیف سی جھلک اس نے اپنی اس نظم میں دکھائی ہے جو ''حسن وعشق'' کے عنوان سے بانگِ درا میں شامل ہے۔ مضمون کے علاوہ اس نظم میں حسنِ شعریت، تراکیب کی نُدرت، تشبیہات کی موزونیت اور استعارات کی برجستگی دیکھئے اور پھر اندازہ لگائیے کہ ابتداء ہی سے فطرت نے اس حقائق شناس قلب کو اسلوب بیان بھی کس قدر حسین ودلکش عطا فرمایا تھا۔ (یہ 1905ء اور 1908ء کے درمیانی دور کی نظموں میں سے ہے) کہتے ہیں۔

جس طرح ڈوبتی ہے کشتیٔ سیمینِ قمر
نورِ خورشید کے طوفان میں ہنگامِ سحر
جیسے ہو جاتا ہے گم نور کا آنچل لے کر
چاندنی رات میں مہتاب کا ہمرنگ کنول
جلوۂ طور میں جیسے یدِ بیضائے کلیم
موجۂ نگہتِ گلزار میں غنچے کی شمیم
ہے ترے سیلِ محبت میں یونہی دل میرا
ہے میرے باغِ سخن کے لئے تو بادِ بہار
میرے بیتاب تخیل کو دیا تو نے قرار
جب سے آباد ترا عشق ہوا سینے میں
نئے جوہر ہوئے پیدا میرے آئینے میں
حسن سے عشق کی فطرت کو ہے تحریک کمال
تجھ سے سرسبز ہوئے میری امیدوں کے نہال
قافلہ ہو گیا آسودۂ منزل میرا

یہ عشق کی پہلی منزل تھی جس میں قرار وسکون ہی مدعائے حیات سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اس کے بعد وہ منزل آئی جس میں شورش وحرارت مقصودِ کائنات نظر آتا ہے۔ عشق کی ان بلا انگیز شورشوں میں وہ لذت تھی کہ اقبالؒ اس حظ وکیف کے لئے قدم قدم پر ھل من مزید کی دعائیں کرتا اور عجیب رقص ومستی میں پکار اٹھتا تھا کہ

گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر
ہوش و خرد شکار کر، قلب و نظر شکار کر
عشق بھی ہو حجاب میں حسن بھی ہو حجاب میں
یا تو خود آشکار ہو، یا مجھے آشکار کر

جب اقبالؒ کو اس کشمکشِ پیہم سے اس طرح فراغ نصیب ہو گیا تو اس نے عقل وخرد کے اس تمام دفترِ بے معنی پر، جو اپنے آپ کو وجہِ قیامِ کائنات سمجھے ہوئے تھا، ایک تبسم ریز نگاہ ڈالی اور اس سے اپنے مخصوص انداز میں کہہ دیا کہ

تیری متاعِ حیات، علم و ہنر کا سرور
میری متاعِ حیات، ایک دلِ ناصبور

فلسفہ نے یہ سنا تو اقبالؒ سے پوچھا کہ ذرا یہ تو بتایئے کہ اس آشفتہ سامانی اور چاک گریبانی کی منطقی توجیہ کیا ہے؟ اقبالؒ نے ہنس کر کہا کہ

حکیم میری نواؤں کا راز کیا جانے
ورائے عقل ہیں اہلِ جنوں کی تدبیریں

جاتے جاتے طبعیات کی جھاڑیوں نے اس کا دامن الجھایا اور کہا کہ ذرا ٹھہریئے کہ آپ کو آغازِ حیات کا راز بتاؤں۔ اقبالؒ نے سنا اور قلندرانہ استغناء کی شان سے جواب دیا کہ

خردمندوں سے کیا پوچھوں کہ میری ابتدا کیا ہے
کہ میں اس فکر میں رہتا ہوں میری انتہا کیا ہے

فلکیات نے کہا کہ میری رصدگاہوں سے فضائے آسمانی کی محیر العقول پہنائیوں اور ان میں تیرنے والے تحیر انگیز کروں کا تماشا نظر آئے گا۔ اس مردِ دانا نے سنا اور ایک خندۂ زیر لبی

سے جواب دیا کہ اب یہ لاانتہا وسعتیں میرے لئے کوئی حقیقت نہیں رکھتیں۔

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو لامکاں سمجھا تھا میں

☆☆☆☆☆

اقبالؒ کے سامنے جب مقصودِ حیات اس طرح واضح ہو گیا تو اس نے اپنے لئے مستقبل کا راستہ متعین کرلیا۔ اس کے سامنے عشق کے اس زندگی بخش پیغام کو تمام دنیا کے انسانوں میں عام کرنا تھا۔ یاد رکھئے۔ جیسا کہ میں آگے چل کر بتاؤں گا۔ عشق سے اقبالؒ کی مراد وہ نظام ربوبیت تھا جو وحی کی بنیادوں پر استوار ہوتا تھا اور جس کا مقصود نوعِ انسانی کی فطری صلاحیتوں کا کامل نشو ارتقا تھا۔ یہ نظام تمام انسانیت کے لئے تھا لیکن اس کی ابتداء کسی ایسے خطۂ زمین اور ایسے گروہ سے کی جاسکتی تھی جو اس پیغام کی عملی تشکیل کے لئے اولین خمیر بن سکے۔ اس نے جب اپنی قوم پر نگاہ ڈالی تو اسے یکسر راکھ کا ڈھیر پایا۔ بایں ہمہ' اسے اس راکھ کے ڈھیر کے نیچے سلگتی ہوئی چنگاریاں بھی دکھائی دیں۔ اس نے تہیہ کرلیا کہ وہ اپنی آتش نوائی سے اس راکھ کے ڈھیر کو شعلۂ جوالہ بنا کر اس سے نوعِ انسانی کے لئے زندگی کی حرارت کا کام لے گا چنانچہ اس نے یورپ ہی سے اپنے رفقاء کو اپنے اس پروگرام سے آگاہ کر دیا۔ عبدالقادر مرحوم کے نام اپنے خط میں لکھتے ہیں:

اٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا اُفقِ خاور پر
بزم میں شعلہ نوائی سے اجالا کر دیں
ایک فریاد ہے مانند سپند اپنی بساط
اسی ہنگامے سے محفل تہ و بالا کر دیں
اہلِ محفل کو دکھا دیں اثرِ صیقلِ عشق
سنگِ امروز کو آئینۂ فردا کر دیں
شمع کی طرح جئیں بزم گہ عالم میں
خود جلیں' دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں

بلکہ اس سے بھی زیادہ واضح اور متعین انداز سے کہ

گئے وہ ایام اب زمانہ نہیں ہے صحرا نوردیوں کا
جہاں میں مانندِ شمع سوزاں' میانِ محفل گداز ہو جا
وجود افراد کا مجازی ہے ہستی قوم ہے حقیقی
فدا ہو ملت پہ یعنی آتش زنِ طلسمِ مجاز ہو جا
یہ ہند کے فرقہ ساز اقبال آذری کر رہے ہیں گویا
بچا کے دامن بتوں سے اپنا غبار راہِ حجاز ہو جا

ان آرزوؤں اور دعاؤں' ان ولولوں اور تمناؤں کو دل میں لے کر اقبالؒ ہندوستان واپس آیا۔ گیا تو ایک مجموعۂ اضداد تھا۔ واپس آیا تو ہمہ تن یک رنگ و یک آہنگ۔ گیا تو دل میں شکوک وشبہات کی ہزاروں پھانسیں لئے ہوئے۔ آیا تو اسے سکون وطمانیت کی جنت بنائے ہوئے۔ گیا تھا فلسفی بننے کے لئے۔ آیا نوع انسانی کے لئے پیامبر بن کر۔ گیا تھا سازِ عقل لے کر' آیا سوزِ عشق خرید کر اور اس متاع سوز وساز اور سرمایۂ تپش وگداز کو لے کر آیا۔ اس برف آلود سرزمینِ مغرب سے جہاں عشق وایمان کی رہی سہی چنگاریاں بھی بجھ جایا کرتی ہیں۔ گیا تھا تو وہ انداز تھا اور واپس آیا تو اس شان سے کہ کیف ومستی کی فضاؤں میں جھوم رہا ہے اور وجد ورقص کے عالم میں گنگنا رہا ہے کہ

کافر ہندی ہوں میں' دیکھ میرا ذوق و شوق
دل میں صلوٰۃ و درود' لب پہ صلوٰۃ و درود
شوق میری لے میں ہے' شوق میری نے میں ہے
نغمہ اللہ ہو' میرے رگ و پے میں ہے

لیکن عشق وجنون کی ان وادیوں میں پہنچ کر اقبالؒ نے عقل کو تیاگ نہیں دیا۔ اس لئے کہ عقل وخرد کو تیاگ دینا' قرآن کا پیغام نہیں رہبانیت کا مسلک ہے۔ قرآن کی رو سے عقل اور وحی کا تعلق ایسا ہی ہے جیسے انسان کی آنکھ اور روشنی کا تعلق ہے جو اپنی آنکھ سے کام نہیں لیتا اس کے لئے روشنی کا عدم و وجود برابر ہے اور آنکھ بغیر روشنی کے بیکار ہے۔ لہٰذا قرآن کا پیغام عقل کو وحی کے تابع رکھنا اور ان دونوں کے امتزاج سے ایک نئی دنیا کی تعمیر کرنا ہے۔ چنانچہ عقل وعشق' خرد و

جنوں؛ ذکر وفکر، خبر ونظر، علم وحضور کے اس حسین امتزاج کا نام تھا۔ اقبالؒ جس نے کہا کہ

خرد نے مجھ کو عطا کی نظر حکیمانہ
سکھائی عشق نے مجھ کو حدیثِ رندانہ

اور مشرق و مغرب دونوں کو یہ پیغام دیا کہ

غربیاں را زیرکی سازِ حیات
شرقیاں را عشق رازِ کائنات
زیرکی از عشق گردد حق شناس
کارِ عشق از زیرکی محکم اساس
عشق چو با زیرکی ہمبر شود
نقشبندِ عالمِ دیگر شود
خیز و نقشِ عالمِ دیگر بنہ
عشق را با زیرکی آمیز دہ

مغرب نے تنہا عقل کی ابلہ فریبیوں سے ساری دنیا کو قمار خانہ بنا رکھا تھا۔ مشرق میں ملاّ اور صوفی کی کم نگہی نے اسلام جیسے انقلاب در آغوش نظامِ حیات کو بے نتیجہ رسوم کا مجموعہ اور محکومی و نا امیدی کے مسلک گوسفندی کا نقیب قرار دے رکھا تھا۔ اقبالؒ کے پیشِ نظر مغرب اور مشرق کے ان دونوں تصوراتِ زندگی کے خلاف جنگ کرنا تھا۔ چونکہ فطرت نے اقبالؒ سے یہ بہت بڑا کام لینا تھا اس لئے اسے اس مقصدِ عظیم کے لئے خاص طور پر تیار کیا گیا۔ ''فرشتوں کے نام خدا کے پیغام'' میں ہے کہ

تہذیبِ نوی کارگہِ فتنہ گری ہے
آدابِ جنوں شاعرِ مشرق کو سکھا دو

اور انہی آدابِ جنوں کا اثر تھا کہ اس نے تہذیبِ حاضر کے اس نگاہ فریب طلسم کو توڑ کر رکھ دیا

فرنگی شیشہ گر کے فن سے پتھر ہو گئے پانی
مری اکسیر نے شیشے کو بخشی سختیٔ خارا

لیکن تہذیبِ نو کے اس سیلاب سے کہیں زیادہ ہلاکت انگیز خود اپنے ہاں کے مکتب و

خانقاہیت کی تعلیم تھی جس کے خلاف اقبالؒ کو مسلسل جہاد کرنا تھا۔ اس کے لئے اس نے متلاشیان حقیقت کو پکار کر کہا کہ

مرے کدو کو غنیمت سمجھ کہ بادۂ ناب
نہ مدرسے میں ہے باقی نہ خانقاہ میں ہے

وہ ان سے بار بار کہتا کہ

رہ و رسمِ حرم نامحرمانہ
کلیسا کی ادا سوداگرانہ
تبرک ہے مرا پیراہنِ چاک
نہیں اہلِ جنوں کا یہ زمانہ

اس نے دیکھا کہ مدعیانِ علمِ شریعت انسانی زندگی کے ابتدائی مسائل تک سے ناواقف ہیں اس لئے ان کے لئے قطعاً ناممکن ہے کہ وہ مقامِ کبریا کو پہچان سکیں۔ اس نے ملاّ سے برملا کہا کہ

عجب نہیں کہ خدا تک تری رسائی ہو
تری نگہ سے ہے پوشیدہ آدمی کا مقام
تری نماز میں باقی جلال ہے نہ جمال
تری اذاں میں نہیں ہے مری سحر کا پیام

جب ارباب شریعت وطریقت کی سطح بیں نگاہیں اس کے حقیقت رس پیغام پر تنقید کرتیں تو وہ اپنے مخصوص انداز میں مسکراتا اور بے نیازانہ کہہ دیتا کہ یہ بیچارے معذور ہیں اس لئے معاف کر دینے کے قابل۔ یہ نہیں جانتے کہ میں کیا کہتا ہوں اور کس مقام سے کہتا ہوں۔

کیا صوفی و ملاّ کو خبر میرے جنوں کی
ان کا سرِ دامن بھی ابھی چاک نہیں ہے

لیکن جاننے والی نگاہیں جانتی تھیں کہ یہ دانندۂ اسرار حقیقت کیا کہتا ہے۔ وہ ایک دوسرے سے ملتے اور اعتراف کرتے کہ

رازِ حرم سے شاید اقبال باخبر ہے
ہیں اس کی گفتگو کے انداز محرمانہ

وہ جانتا تھا کہ ہماری مروجہ شریعت اور طریقت دونوں کے مستعار تصورات اسلام کے عجمی ایڈیشن ہیں جن پر صرف ڈسٹ کور (Dust-Cover) قرآن کا ہے۔ اسے خوب معلوم تھا کہ یہ عجمی نظریاتِ زندگی فکر اسلامی کے شجر طیب پر اکاس بیل کی طرح مسلط ہیں۔ جب تک اس اکاس بیل کو الگ نہیں کیا جائے گا۔ شجرِ ملت کبھی شگفتہ و شاداب نہیں ہو سکے گا۔ اس لئے وہ پوچھنے والوں سے کہتا کہ

کئے ہیں فاش رموزِ قلندری میں نے
کہ فکرِ مدرسہ و خانقاہ ہو آزاد

ظاہر ہے کہ ایسے انقلاب آفریں پیغام کی ہر طرف سے مخالفت ہونی تھی۔ لیکن اس نے اس مخالفت کی کوئی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنی آتش نوائی کو مسلسل جاری رکھا اور اس طرح رفتہ رفتہ فضائے ملت اس کی آہِ نیم شبی اور نالۂ سحری سے اثر پذیر ہوتی چلی گئی۔ اسی حقیقت کے پیشِ نظر اس نے کہا تھا کہ

مری نوا سے ہوئے زندہ عارف و عامی
دیا ہے میں نے انہیں ذوق آتش آشامی

لیکن اس کے باوجود اس کی قوم جس خواب گراں میں سو رہی تھی اسے اس سے جگانا کچھ آسان کام نہ تھا۔ ہزار برس سے گاڑی زندگی کی صراطِ مستقیم چھوڑ کر دوسری پٹڑی پر چلی جا رہی تھی۔ اسے اس مقام سے واپس لا کر پھر سے صحیح لائن پر ڈالنا' آفتابِ مغرب کی طنابیں کھینچ کر اسے سوئے مشرق لانا تھا۔ اسے خدا سے شکایت ہی یہ تھی۔

میں بندۂ ناداں ہوں مگر شکر ہے تیرا
رکھتا ہوں نہانخانۂ لاہوت سے پیوند
اک ولولۂ تازہ دیا میں نے دلوں کو
لاہور سے تا خاکِ بخارا و سمرقند
تاثیر یہ ہے میرے نفس کی کہ خزاں میں
مرغانِ سحر خواں مری صحبت میں ہیں خورسند

لیکن مجھے پیدا کیا اس دیس میں تو نے
جس دیس کے بندے ہیں غلامی پہ رضا مند

واضح رہے کہ اقبالؒ کے نزدیک آزادی سے مفہوم یہ نہیں تھا کہ انگریزوں کی بجائے حکومت ہمارے اپنے ہاتھ میں آجائے۔ بلکہ یہ کہ اس خطۂ زمین کے مسلمان، انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کی بجائے، ضابطۂ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرسکیں، اسی مقصد کے لئے اس نے ملت اسلامیہ کو پاکستان کا تصور دیا تھا۔ لیکن قوم نے اس وقت اس تصور کو ایک شاعر کا افسانوی تخیل سمجھ کر اس پر غور وفکر کی بھی ضرورت نہ سمجھی۔ ایک طرف اپنی قوم کا یہ عالم تھا اور دوسری طرف مخالف قوتیں برق رفتاری کے ساتھ چاروں طرف سے ہجوم کر کے امنڈے چلی آرہی تھیں۔ حالات ایسے نامساعد تھے لیکن بایں ہمہ، وہ اس سیلاب بلا انگیز میں روشنی کے مینار کی طرح کھڑا تھا کہ زمانہ کی تلاطم انگیز موجیں آئیں اور اپنا سر پھوڑ کر واپس چلی جائیں۔ یہی تھے وہ حالات جن کے متعلق اس نے کہا تھا کہ

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیئے ہیں اندازِ خسروانہ

ان ناموافق حالات میں ہمرہانِ سست عناصر اسے مایوسیوں کے چھلاوے سے ڈراتے اور ٹھنڈی سانس بھر کر کہتے کہ۔

ہر نفس اقبال تیرا آہ میں مستور ہے
سینۂ سوزاں ترا فریاد سے معمور ہے
قصۂ گل ہم نوایانِ چمن سنتے نہیں
اہلِ محفل تیرا پیغامِ کہن سنتے نہیں
زندہ پھر وہ محفلِ دیرینہ ہو سکتی نہیں
شمع سے روشن شبِ دوشینہ ہو سکتی نہیں

تو اس کا چہرہ تمتما اٹھتا، پیشانی جوشِ حمیت سے شفق آلود ہو جاتی۔ وہ امیدوں کی ایک دنیا اپنے جلو میں لئے اٹھتا اور حزم ویقین کی پوری قوتوں سے کہتا کہ

ہم نشیں! مسلم ہوں میں، توحید کا حامل ہوں میں
اس صداقت پر ازل سے شاہدِ عادل ہوں میں
نبض موجودات میں پیدا حرارت اس سے ہے
اور مسلم کے تخیل میں جسارت اس سے ہے
حق نے عالم اس صداقت کے لئے پید اکیا
اور مجھے اس کی حفاظت کے لئے پیدا کیا
میری ہستی، پیرہن عریانیٔ عالم کی ہے
میرے مٹ جانے سے رسوائی بنی آدم کی ہے
کب ڈرا سکتا ہے غم کا عارضی منظر مجھے
ہے بھروسا اپنی ملت کے مقدر پر مجھے
ہاں یہ سچ ہے، چشم برعہد کہن رہتا ہوں میں
اہلِ محفل سے پرانی داستاں کہتا ہوں میں
یادِ عہد رفتہ میری خاک کو اکسیر ہے
میرا ماضی میرے استقبال کی تفسیر ہے
سامنے رکھتا ہوں اس دورِ نشاط افزا کو میں
دیکھتا ہوں دوش کے آئینے میں فردا کو میں

وہ جانتا تھا کہ ناامیدیوں کے چھلاوے سے ڈرانے والے وہ ہیں کہ مدت ہائے دراز سے تقلید اور بے عملی کے حیات سوز اثرات ان کی ہڈیوں کے گودے تک میں سرایت کر چکے ہیں اور وہ اپنی زندگی میں خفیف سی تبدیلی کے تصور تک سے گھبرا اٹھتے ہیں۔ وہ ان پیرانِ کہن سے کوئی توقع نہیں رکھتا تھا، اس لئے وہ اپنے پیغام کا حقیقی مخاطب ان نوجوانوں کو سمجھتا تھا جن کے قلب ونگاہ کی تبدیلی، قوموں کی تقدیریں بدل دیا کرتی ہے۔ انہی کو وہ اپنی متاع سوز وگداز کا وارث سمجھتا اور انہی کے لئے راتوں کو اٹھ اٹھ کر دعائیں مانگا کرتا تھا کہ:

شرابِ کہن پھر پلا ساقیا
وہی جام گردش میں لا ساقیا
خرد کو غلامی سے آزاد کر
جوانوں کو پیروں کا استاد کر
تڑپنے پھڑکنے کی توفیق دے
دلِ مرتضیٰؓ، سوزِ صدیقؓ دے
ترے آسمانوں کے تاروں کی خیر
زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر
جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے
مرا عشق میری نظر بخش دے
مرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں
مرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں
مرے نالۂ نیم شب کا نیاز
مری خلوت و انجمن کا گداز
امنگیں مری، آرزوئیں مری
امیدیں مری جستجوئیں مری
یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر
اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر
مرے قافلے میں لٹا دے اسے
لٹا دے ٹھکانے لگا دے اسے

ملت کے مستقبل کا یہی غمِ پنہاں تھا جس نے اقبالؒ پر راتوں کی نیند حرام کر رکھی تھی۔ علی بخش کا بیان ہے کہ جن دنوں آپ کی طبیعت زیادہ خراب تھی، ایک رات، پچھلے پہر، میں نے سنا کہ پلنگ سے سسکیوں کی آواز آ رہی ہے۔ چپکے سے قریب گیا تو دیکھا کہ آپ تکیہ پر کہنیاں ٹیکے

دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بیٹھے ہیں اور زار و قطار رو رہے ہیں۔ رو رہے اور گنگنا رہے ہیں کہ

مجھے آہ و فغانِ نیم شب کا پھر پیام آیا
تھم اے رہرو! کہ پھر شاید کوئی مشکل مقام آیا

اس غزل کے دو شعر اور بھی سنئے۔ فرماتے ہیں۔

ذرا تقدیر کی گہرائیوں میں ڈوب جا تو بھی
کہ اس جنگاہ سے میں بن کے تیغِ بے نیام آیا
چل اے میری غریبی کا تماشا دیکھنے والے
وہ محفل اُٹھ گئی جسدم کہ مجھ تک دور جام آیا

علی الصباح حسب معمول حکیم صاحب آئے۔ دیکھا تو رنگ معمول سے زیادہ زرد ہے اور چہرہ پہلے سے زیادہ افسردہ۔ آنکھیں سوج رہی ہیں اور کمزوری بڑھ گئی ہے۔ کیفیت مزاج کا پوچھا تو آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اور بمشکل اتنا کہہ سکے کہ

کس سے کہوں کہ زہر ہے میرے لئے مئے حیات
کہنہ ہے بزمِ کائنات تازہ ہیں میرے واردات

حکیم صاحب نے ہلکے سے تبسم سے کہا کہ آپ تو دنیا بھر کے مسائل کا حل دوسروں کو بتاتے رہتے ہیں۔ اپنی مشکل کا حل کیوں نہیں تلاش کر پاتے! انہوں نے بھی اسی انداز کے تبسم زیر لبی سے فرمایا کہ کیا کہوں!

مقام ہوش سے آساں گذر گیا اقبال
مقام شوق میں کھویا گیا یہ دیوانہ

حکیم صاحب نے پوچھا کہ بالآخر وہ کونسی بات ہے جس کا غم آپ کو اس طرح نڈھال کئے جا رہا ہے۔ کہا کہ حکیم صاحب! آپ دیکھتے نہیں کہ

جلوتیانِ مدرسہ کور نگاہ و مردہ ذوق
خلوتیانِ میکدہؑ کم طلب و تہی کدو

میں کہ مری غزل میں ہے آتشِ رفتہ کا سراغ
میری تمام سرگذشت' کھوئے ہوؤں کی جستجو

حکیم صاحب نے کہا کہ آپ کا مرض زیادہ تشویش انگیز ہوتا جا رہا ہے۔آپ کو' کچھ دنوں کے لئے ان تفکرات کو چھوڑنا ہو گا۔ انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا کہ حکیم صاحب! میں جانتا ہوں کہ

پھونک ڈالا ہے مری آتش نوائی نے مجھے

لیکن یہ بھی تو حقیقت ہے کہ

اور میری زندگانی کا یہی ساماں بھی ہے

اتنے میں ڈاک آ گئی۔ دیکھا تو اس میں ایک خط ایک ایسے فلسفہ زدہ نوجوان کا تھا جس کے والد سے آپ کے دیرینہ مراسم تھے۔ اسنے جیسا کہ فلسفہ کے ابتدائی مراحل میں اکثر ہوتا ہے جب کہ طالب علم کے افکار میں ہنوز پختگی نہیں آتی' نفسِ انسانی' وحی' حیات بعد الممات' مستقل اقدار وغیرہ تصورات پر نہایت طنز آمیز اعتراضات کئے تھے۔آپ نے خط پڑھ کر پنسل اٹھائی اور اسی کی پشت پر لکھ دیا کہ

میں اصل کا خاص سومناتی
آباء مرے لاتی و مناتی
تو سید ہاشمی کی اولاد
میری کفِ خاک برہمن زاد
ہے فلسفہ میرے آب و گل میں
پوشیدہ ہے ریشہ ہائے دل میں
اقبال اگرچہ بے ہنر ہے
اس کی رگ رگ سے باخبر ہے
شعلہ ہے ترے جنوں کا بے سوز
سن مجھ سے یہ نکتۂ دل افروز

افکار کے نغمہ ہائے بے صوت
ہیں ذوقِ طلب کے واسطے موت
دِیں مسلکِ زندگی کی تقویم
دِیں سِر محمدؐ و براہیم
دل در سخنِ محمدیؐ بند
اے پُورِ علیؓ ' زبو علی چند

ابھی اس خط کا جواب ختم نہیں ہونے پایا تھا کہ لاہور کے ایک مشہور روزنامہ کے مدیر جن کا شمار آپ کے حلقۂ ارادتمندان میں ہوتا تھا' اندر آ گئے۔ خیریت مزاج کے بعد کہا کہ آپ نے دیکھا ہے کہ آپ کے حالیہ بیان پر فلاں اخبار کے ایڈیٹر نے کیسے رکیک حملے کئے ہیں۔ آپ مسکرائے اور کہا کہ میں نے دیکھا تو نہیں۔ کل شام فلاں صاحب سے سنا ضرور تھا۔ انہوں نے جھجکتے ہوئے پوچھا کہ کیا آپ کوئی جواب لکھیں گے۔ آپ نے اس کی طرف مڑ کر دیکھا اور کہا' کہ بھائی! میں ان جھمیلوں میں کبھی نہیں الجھتا؟ آپ مجھے جانتے ہیں کہ

درویشِ خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند
کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
نے ابلہ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند
اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند
ہوں آتشِ نمرود کے شعلوں میں بھی خاموش
میں بندۂ مومن ہوں' نہیں دانۂ اسپند
پرسوز و نظر باز ونکوبین و کم آزار !
آزاد و گرفتار و تہی کیسہ و خورسند

ہر حال میں میرا دلِ بے قید ہے خرم
کیا چھینے گا غنچے سے کوئی ذوقِ شکرخند

حتیٰ کہ میرا تو یہ عالم ہے کہ

چپ رہ نہ سکا حضرتِ یزداں میں بھی اقبال
کرتا کوئی اس بندۂ گستاخ کا منہ بند

مدیر صاحب نے کہا کہ درحقیقت یہ ایک سازش ہے دوقوموں کے اس نظریہ کے خلاف جس کا تصور آپ نے پیش کیا ہے اور جس کی رُو سے مسلمانانِ ہند کو اپنے مستقبل کے لئے ایک واضح اور درخشاں نصب العین مل گیا ہے۔ آپ نے پھر مسکرا کر فرمایا کہ سازش ہے تو ہوا کرے مجھے اس کی کیا پرواہ ہے۔

رہے ہیں اور ہیں فرعون میری گھات میں ابتک
مگر کیا غم کہ میری آستیں میں ہے یدِ بیضا

بعد سہ پہر، حسب معمول، پھر ملنے والوں کا اجتماع ہوا۔ دنیا بھر کے مسائل پر گفتگو ہوتی رہی۔ ایک صاحب نے کہا کہ (مولانا) حسین احمد مدنی نے آپ کے اشعار کے جواب میں جو بیان دیا ہے وہ آپ کی نظروں سے گذرا! فرمایا کہ ہاں میں نے دیکھا ہے۔ اسنے کہا کہ مولوی صاحب نے قوم اور ملت کے متعلق جو لفظی بحث چھیڑی ہے آپ اس کا کچھ جواب دیں گے؟ فرمایا کہ

قلندر جز دو حرفِ لا الہٰ کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیہہِ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا
حدیثِ بادہ و مینا و جام آتی نہیں مجھ کو
نہ کر خارا شگافوں سے تقاضا شیشہ سازی کا

پھر حقہ کا کش لگایا اور مسکراتے ہوئے فرمایا

کہاں سے تو نے اے اقبال سیکھی ہے یہ درویشی
کہ چرچا بادشاہوں میں ہے تیری بے نیازی کا

آپ کے حلقہ احباب میں بعض لوگ ایسے بھی تھے جنہیں ہمیشہ اس بات کا قلق رہتا کہ

نالائق اور جاہل لوگ بڑے بڑے مناصب و مدارج حاصل کئے جاتے ہیں اور آپ ہیں کہ جن کی قابلیت کا سکہ ساری دنیا مان رہی ہے لیکن اس طرح ایک گوشے میں پڑے ہیں۔ وہ آتے اور آپ سے کہتے کہ فلاں اسامی خالی ہو رہی ہے۔ آپ اپنی آمادگی ظاہر کر دیجئے' فوراً کامیابی ہو جائے گی۔ آپ ان مخلص بہی خواہوں کی سادگی پر مسکراتے اور جی ہی جی میں کہتے کہ میں انہیں کس طرح بتاؤں کہ مبداء فیض کی عنایاتِ خسروانہ نے مجھے کیا عطا کیا ہے اور یہ مجھے کس طرف بلا رہے ہیں۔ وہ زیادہ اصرار کرتے تو آپ ان سے کہتے کہ

فطرت نے نہ بخشا مجھے اندیشۂ چالاک
رکھتی ہے مگر طاقتِ پرواز مری خاک
وہ خاک کہ ہے جس کا جنوں صیقلِ ادراک
وہ خاک کہ جبریل کی ہے جس سے قبا چاک
وہ خاک کہ پروائے نشیمن نہیں رکھتی
چنتی نہیں پہنائے چمن سے خس و خاشاک
اس خاک کو اللہ نے بخشے ہیں وہ آنسو
کرتی ہے چمک جس کی ستاروں کو عرق ناک

جاوید سے آپ کو بہت محبت تھی۔ وہ ابھی بچہ ہی تھا لیکن اس سے آپ بڑے کام کی باتیں کرتے تھے۔ ایک دن اس نے پوچھا کہ ابا جان آپ کے پاس نہ اچھے اچھے کپڑے ہیں' نہ قیمتی صوفے اور قالین ہیں۔ نہ بہت سے نوکر چاکر ہیں' نہ موٹر ہی ہے۔ لیکن آپ کے پاس بڑے بڑے لوگ آتے ہیں۔ یہ آپ کی اتنی عزت کیوں کرتے ہیں؟ آپ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا کہ بیٹا!

ہے میری بساط کیا جہاں میں
بس ایک فغانِ زیر بامی
اک صدقِ مقال ہے کہ جس سے
میں چشم جہاں میں ہوں گرامی

جب آپ لندن گئے ہیں تو جاوید نے پہلا خط اپنے ہاتھ سے لکھ کر بھیجا۔ اس کے جواب میں آپ نے اسے لکھا کہ

دیار عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر
خدا اگر دلِ فطرت شناس دے تجھ کو
سکوتِ لالہ و گل سے کلام پیدا کر
میں شاخِ تاک ہوں میری غزل ہے میرا ثمر
مرے ثمر سے مئے لالہ فام پیدا کر
مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

☆☆☆

زمانہ آگے بڑھتا گیا اور اس کے ساتھ ہی اقبالؒ کے پیغام کی تندی اور تیزی بھی شدت اختیار کرتی چلی گئی۔ اس کی نگہ بصیرت دیکھ رہی تھی کہ دنیا میں کیا ہونے والا ہے اور اس کی بساطِ سیاست پر مسلمان کس طرح پٹ رہا ہے۔ اس آنے والے انقلاب کے تصور سے جوں جوں اس کا احساس شدید ہوتا جاتا اس کی نوا کی تلخی بھی تیز ہوتی جاتی۔ اقبالؒ کے پیشِ نظر پوری انسانیت کے اندر ایک ایسا انقلاب برپا کرنا تھا جس سے یہ زمین بدل جائے' یہ آسمان بدل جائے اور خاکِ آدم کو وہ نمود حاصل ہو جس کے لئے اسے اس طرح سنوارا گیا تھا۔ انقلاب آفرینی کا یہی وہ جذبہ تھا جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا ہے کہ

حضورِ حق میں اسرافیل نے میری شکایت کی
یہ بندہ وقت سے پہلے قیامت کر نہ دے پیدا
ندا آئی کہ آشوبِ قیامت سے یہ کیا کم ہے
گرفتہ چینیاں احرام و مکی خفتہ در بطحا

دوسرے مقام پر کہتے ہیں کہ

کی حق سے فرشتوں نے اقبال کی غمازی
گستاخ ہے کرتا ہے فطرت کی حنا بندی
خاکی ہے مگر اس کے انداز ہیں افلاکی
رومی ہے نہ شامی ہے کاشی نہ سمرقندی
سکھلائی فرشتوں کو آدم کی تڑپ اس نے
آدم کو سکھاتا ہے' آدابِ خداوندی

اُدھر آسمان پر تو یہ باتیں ہو رہی تھیں لیکن ادھر زمین والے ہنوز یہی طے نہیں کر پائے تھے کہ اقبالؒ جو کچھ کہتا ہے اسکا سرچشمہ کیا ہے؟ کوئی کہتا کہ اس کے کلام میں سوز و گداز اور کیف و مستی کے تذکرے ان نقوش کے اثرات کا نتیجہ ہیں جو بچپن کی مشرقی تعلیم اور تصوف آمیز ماحول نے اس کے تحت الشعور میں مرتسم کر رکھے ہیں۔ کوئی کہتا کہ اسکی فکر' نیٹشے ' برگسان' الیگزینڈر' وارڈ' جیمز' جیسے مغربی مفکرین کے فلسفہ کی رہین منت ہے۔ اقبالؒ یہ سب کچھ سنتا اور ان سادہ لوح معترضین سے کہتا کہ جب تم اس منبع علم و یقین سے آشنا نہیں ہو جو میری فکر کا سرچشمہ ہے تو اس باب میں قیاس آرائیاں کیوں کرتے ہو؟ میری فکر نہ مشرقی مکتب و خانقاہ سے متاثر ہے نہ مغربی حکمت و فلسفہ کی منت پذیر۔

نہ فلسفی سے نہ مُلّا سے ہے غرض میری
یہ دل کی موت وہ اندیشہ و نظر کا فساد

میں نے مشرق و مغرب دونوں کے علوم و فنون کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ ان میں مجھے حقیقت کا کہیں سراغ نہیں ملا۔

بہت دیکھے ہیں میں نے مشرق و مغرب کے میخانے
یہاں ساقی نہیں پیدا وہاں بے ذوق ہی صہبا

میری فکر کسی سے بھی متاثر نہیں۔ میں نے کسی چیز کو تقلیداً دیکھا ہی نہیں بلکہ ہر شے کو از خود پرکھا ہے اور اپنے نتائج آپ مستنبط کئے ہیں۔

میانِ آب و گل خلوت گزنیم
ز افلاطون و فارابی بریدم
نگردم از کسے دریوزۂ چشم
جہاں را جز بہ چشمِ خود نہ دیدم

یہی میرا مسلک ہے جس سے اب کیفیت یہ پیدا ہو چکی ہے کہ لاکھ پردوں میں چھپی ہوئی حقیقت' میری نگۂ تجسس کے سامنے از خود بے نقاب ہو جاتی ہے۔ کیا تم نے سنا نہیں کہ ؂

اقبال نے کل اہلِ خیاباں کو سنایا
یہ شعر نشاط آور و پرسوز و طربناک
میں صورتِ گُل دست صبا کا نہیں محتاج
کرتا ہے میرا جوشِ جنوں میری قبا چاک

یہی وہ حقیقت کشائی ہے جس سے میری دیدہ وری کا یہ عالم ہے کہ

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے
عکس اس کا مرے آئینۂ ادراک میں ہے

چنانچہ وہ جہانِ فردا جس کے انتظار میں آسمان کے تاروں کی آنکھیں ایک مدت سے محروم خواب ہیں' میرا پیام اس کے لئے طائر پیش رس ہے'

عالَمِ نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں
میری نواؤں میں ہے اس کی سحر بے حجاب

لہٰذا اس عالمِ ہست و بود کی حقیقت صرف اس پر کھل سکتی ہے جس کی سمجھ میں میرا پیغام آ جائے۔

نظر آئے گا اسی کو یہ جہانِ دوش و فردا
جسے آ گئی میسر مری شوخئ نظارا

لوگ سمجھتے ہیں کہ اقبال' جاوید منزل میں پلنگ پر لیٹے لیٹے حقہ پیتا رہتا ہے اور شاعری کرتا رہتا ہے۔ انہیں کیا معلوم کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔

مرے ہم صفیر اسے بھی اثرِ بہار سمجھے
انہیں کیا خبر کہ کیا ہے یہ نوائے عاشقانہ

یہ شاعری نہیں ہے۔ نہ ہی شاعری کسی پیغام بر کے شایانِ شان ہوتی ہے۔ جس کے سامنے زندگی کا نصب العین متعین ہؤ اس کا ہر قدم اسی نصب العین کی طرف اٹھ رہا ہؤ اور اس لئے وہ ہر مخاطب کو اسی منزل کی طرف لے جا رہا ہؤ اسے شاعری سے کیا واسطہ!

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ میخانہ

یہ وہی ''رازِ درونِ میخانہ'' تھے جن کے متعلق میں نے زبورِ عجم میں کہا ہے کہ

زِبرونِ در گذشتم' ز درونِ خانہ گویم
سخنے نگفتۂ را چہ قلندرانہ گفتم

تم اسے شاعری سمجھتے ہو اور میں شاعری کو اپنے خلاف تہمت خیال کرتا ہوں۔

نہ پنداری کہ من بے بادہ مستم
مثالِ شاعراں افسانہ بستم
نہ بینی خیر ازاں مردِ فرو دست
کہ برما تہمتِ شعر و سخن بست

تم اسے حسن و شباب کے رنگین افسانے سمجھتے ہو؟ تم اسے عہد کہن کی خواب آور داستانیں تصور کرتے ہو؟ تم یہی سمجھے بیٹھے ہو کہ یہ گُل و مُل کی فرضی کہانیاں ہیں؟ تمہارا اندازہ یہی ہے کہ یہ ایک شاعر کی دنیائے تصورات کی پریشاں خیالیاں ہیں؟ اگر تمہارا یہی اندازہ ہے تو کس قدر غلط ہے' تمہارا یہ اندازہ؟ اگر تمہارا یہی خیال ہے تو کس قدر باطل ہے تمہارا یہ خیال! اگر تم جاننا چاہتے ہو کہ جو کچھ میں کہتا ہوں وہ درحقیقت ہے کیا' تم آؤ! میرے مئے سخن کے پیالے میں جھانک کر دیکھو اس میں کیا نظر آتا ہے؟

دو عالم را تواں دیدن بہ مینائے کہ من دارم
کجا چشمے کہ بیند آں تماشائے کہ من دارم

اگر دیوانۂ آید کہ در شہر افگند ہُوئے
دو صد ہنگامہ بر خیزد ز سودائے کہ من دارم
مخور ناداں غم از تاریکیٔ شبہا کہ می آید
کہ چوں انجم درخشد داغِ سیمائے کہ من دارم
ندیمِ خویش می سازی مرا، لیکن ازاں ترسم
نداری تابِ آں آشوبِ غوغائے کہ من دارم

سننے والے یہ سب کچھ سنتے لیکن ان کی سمجھ میں پھر بھی نہیں آتا تھا کہ اگر یہ خیالات نہ فکرِ مغرب سے مستعار لئے ہیں نہ تصوراتِ مشرق سے، نہ یہ مکتب کی زلہ چینی ہے نہ خانقاہ کی دریوزہ گری۔ نہ یہ شاعری ہے نہ افسانہ طرازی۔ تو پھر بالآخر ان تصوراتِ حیات کا سرچشمہ کیا ہے؟ وہ مردِ خود آگاہ و خدا مست یہ کچھ سنتا اور کہتا کہ آؤ! تمہیں بتاؤں کہ میرے انقلاب بردوش پیغام کا سرچشمہ کیا ہے۔ اس کا سرچشمہ ہے۔ ؎

آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم
حکمتِ او لایزال است و قدیم
نسخۂ اسرارِ تکوینِ حیات
بے ثبات از قوتش گیرد ثبات

میں نے عمر بھر اسی شمعِ عالم تاب سے اکتسابِ ضیاء کیا ہے۔ اسی یمِ ناپیدا کنار سے حکمت کے موتی نکالے ہیں۔

گوہرِ دریائے قرآں سفتہ ام
شرحِ رمزِ صبغۃ اللہ گفتہ ام

اس لئے

از تب و تابم نصیبِ خود بگیر
بعد ازیں ناید چومن مردِ فقیر

لیکن سننے والے کہتے کہ اس قرآن کو تو ہم ہر روز پڑھتے ہیں۔ اس کی تفسیریں بھی دیکھتے

ہیں۔ ہمیں تو اس میں یہ کچھ نظر نہیں آتا۔ وہ دانائے راز' ان سادہ لوحوں کی یہ باتیں سنتا اور کہتا کہ قرآن اپنے آپ کو اس طرح بے نقاب نہیں کیا کرتا۔ اس کے سمجھنے کے انداز کچھ اور ہی ہیں۔

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف

اس لئے ؎

چو مسلماناں اگر داری جگر
در ضمیرِ خویش و در قرآں نگر

برادران! یہ ہے وہ اقبالؒ جس نے کہا تھا کہ

چو رختِ خویش بربستم ازیں خاک
ہمہ گفتند باما آشنا بود
و لیکن کس ندانست ایں مسافر
چہ گفت و با کہ گفت و از کجا

(مطبوعہ طلوعِ اسلام، اپریل 1953ء)